

اساسیاتِ اسلام

(۶)

وجودیت کو فلسفہٴ حیات کہنا صحیح نہیں۔ یہ دراصل حد سے بڑھی ہوئی عقلیت (RATIONALISM) اور ان تصورات کے خلاف ایک ردِ عمل کا نام ہے کہ جو انسان کی زندگی میں موزوں مقام عطا نہیں کر سکے۔ کیئر کے گارڈ (KIERKEGAARD) جمیرس (JASERS) اور سارترے (SARTRE) اس اندازِ فکر کے بڑے بڑے نقیب ہیں۔ یہ انسان کے بارہ میں اس تفریق کے قائل نہیں کہ یہ جوہر و عرض سے ترتیب پذیر ہے۔ ان کے نقطہٴ نظر سے انسان ایک وجود ہے جو جذبات، خواہشات اور محرومیوں سے دوچار ہوتا ہے اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کی پریشانیوں اور باطنی دوغلی اضطرابات کو کیونکر رفع کیا جاسکتا ہے۔ اس اشکال کو حل کرنے کے لیے انھوں نے دو بنیادی حقیقتوں کی نشان دہی کی ہے۔ ایک زندگی کا اجمال یا موت اور قطعی عدم کا تصور اور دوسرے آزاد ارادہ۔ زندگی کے بارہ میں یہ لوگ اس لیے زیادہ سوچنے کے عادی نہیں کہ یہ ایک وقفہ ہے نہایت ہی مختصر جس کا محل وقوع عدم سابق اور عدم لاحق کے مابین ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ان کے نزدیک زندگی اصل شئی نہیں۔ اصل شئی عدم محض تو اور فنا ہے۔ اور یہ حیاتِ آساشی جسے ہم زندگی کے آرزو پر درلفظ سے تعبیر کرتے ہیں، صرف فریبِ زندگی ہے۔ جسے بہر حال ختم ہونا ہے۔ زندگی کے بارہ میں یہ تجزیہ اگر درست ہے تو پھر اتنا مختصر سا وقفہ زندگی واقعی کسی بھاری بھارے نظامِ حیات یا فلسفہ کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو اتنا ہی کافی ہے کہ بوقتِ ضرورت ہر شخص اپنی صوابدید یا ارادہ کے مطابق یہ فیصلہ کرے کہ اسے کیا قدم اٹھانا ہے اور کس طرح مشکلات سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ کن چیزوں کو پسند کرنا ہے اور کن چیزوں کو پائے استحقاق سے ٹھکرا نا ہے۔

ہماری رائے میں یہ نقطہ نظر صحیح نہیں۔ زندگی بجائے خود رحمت و نعمت ہے یا اعمال اس کا اندازہ موت کے پیمانے سے نہیں لگایا جاسکتا۔ زندگی کو خود زندگی کے آئینہ میں دیکھیے۔ اس کے بہار آفرین تقاضوں کی شکل میں ملاحظہ کیجیے اور اس کو علمی فنی اور تہذیبی فتوحات اور کامرانیوں کی صورت میں مشاہدہ کیجیے اور پھر یہ بتائیے کہ کیا یہ اللہ کا بہت بڑا انعام نہیں؟ مایوسی، قنوط اور افسردگی فلسفہ حیات نہیں محض مزاج کے تعلق رکھنے والی شے ہے۔ اگر فکر و نظر میں حسن ہے، قلب و نظر میں سرشاری اور انبساط ہے تو پھر نہ صرف یہ رزم گاہ حیات دامن گل فروش ہے بلکہ غم اور اندوہ میں بھی نکھار اور لذت پائی جاتی ہے۔ سقراط نے آخری وہی تو زہر نہیں پی لیا تھا برو نے بجز سوچے سمجھے تو نقد جاں سے محرومی اختیار نہیں کی تھی اور عاشق رسول حضرت حبیب نے بغیر کسی احساس لطف کے تو یہ نہیں فرمایا تھا:

ولست ابالی حین اقتل مسلماً علی ای شتی کان للہ مصرعی

وجودی فلسفہ کے حامی زندگی کو وقت کے طول و عرض سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ زندگی کیفیت کا نام نہیں کیفیت کا نام ہے۔ چنانچہ اہل حق کے نزدیک فکر و تعین کا ایک لمحہ عرفان و وجود اک کا ایک ثانیہ اور نصب العین کو پالینے کی تمنا و آرزو کا ایک پل ایسا خوش آئند اور قیمتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں حیات جاوداں کا طویل ترین عرصہ سراسر بے معنی ہے جس میں فکر و احساس کی جنبشیں نہ پائی جائیں۔ اس فلسفہ میں دوسری عظیم خامی یہ ہے کہ اس میں اقدار حیات کو مستقل حیثیت دی گئی ہے اور خواہ مخواہ فرض کر لیا گیا ہے کہ چونکہ انسانی مشکلات کو جوں کا توں رہنا ہے۔ اضطراب اور بے چینی کو بہر حال پھیلنا ہے اور غم و اندوہ کے مہیب سایوں کو ہر صورت میں آزر دگی اور افسردگی پیدا کرنا ہے۔ اس لیے ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ارادہ یا پسند سے کام لیں اور دیکھیں کہ ہم کس حد تک ان کانٹوں سے اپنا دامن بچا لینے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ارادہ یا پسند سے ان کی کیا مراد ہے؟ سر دست اس پر غور نہ کیجیے۔ غور اس چیز پر کیجیے کہ اقدار حیات یا زیست کی یہ ناہمواریاں کیا ہیں؟ اور آیا ان ناہمواریوں پر ہم قابو پاسکتے ہیں؟ پسپت ہمتی کی اور بات ہے۔ زندگی کے بارہ میں صحت مندانہ نقطہ نظر ہی ہو سکتا ہے کہ انسان نہ صرف اضداد کے ان فاصلوں کو کم کر سکتا ہے کہ جن کی وجہ

سے فضا میں گھٹن اور افسروگی کا دور دورہ ہے۔ بلکہ اس کے ذوقِ جمال سے بجا طور پر یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ زندگی کی زلفِ تابدار کو اور تابدار بنانے کی کوشش کرے گا اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ انسان نے بڑی حد تک اضداد اور ناہمواریوں پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ فکر و نظر کا سب سے بڑا تضاد یہی تھا کہ یہ عالم جس میں رہنے کے لیے ہم مجبور ہیں ہمارا حریف ہے اور کائنات کا عظیم اور بے رحم سلسلہ جس سے ہم دوچار ہیں ہماری زندگی سے نہ صرف یہ کہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتا بلکہ اُلٹے ہمارے درپے آنا ہے۔ اس کھلے ہوئے تضاد پر انسان کے اس داغیبہ و عزم نے قابو پایا ہے کہ ہمیں اس دنیا کو زیرِ فرمان رکھنے کے اس کے راز ہاتے سرسبتہ کو دریافت کرنا ہے اور اس کی پہنائیوں اور وسعتوں سے استفادہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تخلیقی کوششوں سے تضادات کا حلقہ تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جاتے گا۔ دوسرا تضاد جسمِ انسانی کے عوارض اور امراض کا تھا، اس کو بھی طب جدید کی حیرت انگیز ترقی نے قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ چنانچہ اب طاعون، ہیضہ، چیچک، ٹائیفائیڈ اور ذوق کو قابلِ علاج سمجھا جاتا ہے۔ ناقابلِ علاج بیماریوں میں اب صرف سرطان اور فالج کی بعض قسمیں باقی رہ گئی ہیں لیکن انسان مایوس نہیں ہوا۔ ان پر ریسرچ کے بارہ میں لاکھوں روپے صرف ہو رہے ہیں۔

تیسرا تضاد وہ ہے جو فرد و معاشرہ میں تعلقاتِ باہمی کی عدم تعین ہے اور یہ بہت اہم ہے۔ نوعِ انسانی کی بہت سی تکلیفیں محض اس بنا پر پیدا ہوتی ہیں کہ انسانی تعلقات کو ابھی تک ایسے صحیح تر اور سوزوں عمرانی، تمدنی اور تہذیبی سانچوں میں نہیں ڈھال پائے ہیں جو اس خوش حالی کے ضامن ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم و روشنی کے اس دور میں بھی ہماری مصغول میں رنگ و نسل کا تعصب پایا جاتا ہے، خواجہ و بندہ کا امتیاز موجود ہے اور غریب اور امیر میں عناد و دشمنی کی دیواریں حائل ہیں، جو بلن سے بلند تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ معاشرے کے اس تضاد کے متعلق بھی ہم وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ناقابلِ علاج نہیں۔ علمی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی سطح پر اصلاحِ احوال کی کوششیں برابر جاری ہیں جو کامیاب ہو کر ہیں گی۔ انسان تعصبات اور غلط فہمیوں کا ذوقی طور پر شکار ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا احمق نہیں ہے

کہ فلاح و بہبود کے تقاضوں کو ہمیشہ نظر انداز کرتا رہے۔ آخر ایک دن جہالت و تعصب کے اندھیروں کو چھٹنا اور آفتاب حقیقت کو ضیا افروز ہونا ہے۔ موت البتہ ایک ایسا تضاد ہے جو زندہ رہے گا۔ لیکن اس کو بھی اہمال (Amalgamation) سے کیوں تعبیر کیے کیوں ناگزیر حقیقت کہیے۔ اس حادثہ کے لیے جس سے ہر ہر شخص کو ہر حال دوچار ہونا ہے۔ وجودی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر موت کی قطعیت اور سنگینی کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے زندگی کے نقشہ کو ترتیب دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ نقطہ نظر بلاشبہ صحیح ہے۔ اگر ایک شخص مسرت اور خوشی کے لمحوں میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ طرب و اشتیاق کی فرصتیں محض عارضی ہیں تو اس کے طرز عمل میں اس انداز فکر سے ایک طرح کا توازن پیدا ہو جائے گا اور اس کے قلب و ضمیر میں ذمہ داری کا احساس کہیں اور زیادہ بڑھ جائے گا یہی نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ جمالیاتی اور تخلیقی ذوق کے لیے عمر عزیز کا یہ اختصار ہمیز ثابت ہو۔ اور وہ ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جائے کہ جو رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ بنیں۔ موت کی افادیت کا یہ پہلو کیا کم قابلِ غور ہے؟ موت بظاہر ضرور اچانک اور خلاف توقع آتی ہے اور اسی بنا پر خوفناک بھی ہے لیکن اسے ہر طرح کی منطق و قاعدہ سے معرا سمجھنا غلط ہے۔ اس کے پیچھے قوانینِ طبعی کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ اسباب کا فرما ہے جس کی تمام کڑیاں چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہیں اس بنا پر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ اچانک اور بے قاعدہ محض کسی کا سہاگ لٹوٹنے کے لیے آتی ہے یا اس لیے آتی ہے کہ کسی شاداں و فرحاں کتبے سے اس کی عزیز ترین مشاعرہ جھین لے اور عمر بھر کے لیے اس کو محتاج و لاچار بنا دے۔ یہ بات نہیں موت زندگی کا جز ہے اور جز تو کیسی ہے۔ اس کا فرد کی روشنی میں دیکھئے بحیثیت مجموعی نظامِ حیات کے دیکھیے۔ اس سے اخلاق و عادات اور کردار و سیرت میں ایسے ایسے لطائف پیدا ہوتے ہیں جو حیاتِ جاوداں کی شکل میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں اس میں یہ فلسفہ بھی پنہاں ہے کہ یہ زندگی کو زیادہ لذیذ، زیادہ قیمتی اور زیادہ بامعنی بنا دیتی ہے۔ موت نہ ہو تو انسان اس طرح سنگلی اور قساوتِ قلبی کا پیکر بن جاتا اور اس طرح حرص و آرزو اس پر غلبہ پالیں کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو جائے۔

غرض یہ ہے کہ موت کو قدرت کا اہمال نہ کہیے۔ بلکہ یوں کہیے کہ جس طرح زندگی نظامِ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح موت بھی اسی نظم و قاعدہ کا ایک ناگزیر جز ہے۔ سوال دراصل یہ ہے کہ موت جب ایک حقیقت ہے اور ناگزیر حقیقت ہے تو ہمیں اس کے مقابلہ میں زندگی کے بارہ میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس تضاد پر ہم شخصی سطح پر تو قابو پانے سے رہے لیکن یہ چیز تو بہر حال ہمالے اختیار میں ہے کہ اپنے پیچھے اعمالِ خیر کا ایک ایسا زندہ دجا وید سلسلہ چھوڑ جائیں جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ہو۔ اس طرح ہم موت کو بھی گویا شکست دینے میں کامیاب رہیں گے۔

وجودی فلسفہ میں ارادہ یا پسند کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ارادہ یا پسند سے ان کی مراد ایک فرد کی وہ جنبشِ فکر نہیں ہے جو کسی بھی پھیدہ صورتِ حال میں خود بخود عمل کی ایک متعین شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ارادہ یا پسند کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ وہ ایک فرد کا ارادہ یا پسند نہ ہو۔ بلکہ ایسا ہمہ گیر ارادہ یا پسند ہو جس سے پوری انسانیت کی ترجمانی ہوتی ہو۔ جو جمالیاتی معیار کے عین مطابق ہو اور جس کے اختیار کرنے میں ایک شخص پوری طرح آزاد ہو۔ کوئی ادعائیت اس کی راہ نہ روکے، کوئی داخلی و خارجی قدغن یا پابندی اس کے فیصلہ پر اثر انداز نہ ہو۔ اور کوئی عقیدہ یا نظریہ اس کو متاثر نہ کرے۔ ایسا چچا تلا اور آزاد ارادہ یا پسند ہی ایسی خیر ہے کہ جس کے ذریعہ ایک فرد زندگی کے کم از کم عرصے میں اطمینان اور سرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار سمیٹ لینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وجودیت کے فلسفہ میں زبردست خلل یہ ہے کہ اس کی بنیاد دلائل و براہین کے بجائے شعریت (Romanticism) پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قائم کردہ مقدمات () میں پرلے درجے کا اہمام اور تناقض پایا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر ایک ارادہ یا پسند اپنے مزاج کے اعتبار سے شخصی و انفرادی نہیں ہے اور اس کی صحت و استواری کا پیمانہ خود اس شخص کی آرزوئیں، تمنائیں اور فوائد نہیں ہیں بلکہ چاروں ناچار اس کو دوسرے پیمانوں میں ڈھلنا ہے۔ دوسرے معیاروں پر پورا اترنا ہے

تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ اس کو اپنے ارادہ و پسند کے سلسلہ میں کسی نہ کسی نظامِ فکر سے بہرہ حال وابستہ رہنا ہے اور کسی نہ کسی اجتماعی فکر درلے کی پابندی کرنا ہے۔ اس صورت میں فرد کا اپنا آزاد ارادہ کب رہا۔ عقیدہ اور اجتماعیت کی یہی تو ادگن گھاٹی تھی کہ جس کو یہ لوگ غبور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی بد قسمتی دیکھیے کہ اسی میں گھوم پھر کر گریے اور بڑی طرح سے یوں بھی آزادی ارادہ کی اصطلاح بے معنی ہے۔ کیونکہ ارادہ ان کی آن میں ایک لہر یا موج کی صورت میں تہ تیہ نہیں پاتا۔ بلکہ یہ ذہن کا تود غل ہے جو تعلیم و تربیت اور تاثر کے کئی مرحلوں سے گذر کر آخر ایسے فیصلہ کن موڑ پر پہنچتا ہے کہ جہاں اس پر ارادہ کا اطلاق ہوتا ہے اور تعلیم و تربیت اور تاثر کے یہ سلسلے بہر حال سپانوں، عقیدوں اور نظریوں کو یہ بے ہوتے ہوتے ہیں۔ یہ تجزیہ اگر صحیح ہے تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ فرد مجبور ہے کہ اپنے ذہن کو کسی نہ کسی نظامِ فکر کے ساتھ وابستہ رکھے۔

فرض کیجیے ایک شخص ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے جہاں اجتماعی قوانین اور جمہور کا اخلاق اس کی ذاتی خواہشات اور فوائد کے آٹے آتا ہے اور یہی دراصل وہ پیچیدہ مرحلہ ہے جہاں ارادہ و پسند کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اس گروہ اس ماحول کا ساتھ بدرجہ مجبوری دیتا ہے تو اپنی ذات کے ساتھ انصاف روا نہیں رکھتا اور مخالفت کرتا ہے تو معاشرہ اور اس کی اخلاقیات سے غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فیصلہ کی کوئی بھی نوعیت ہو اس سے لامحالہ ایک طرح کا نفاق پیدا ہوگا۔ جو ذات کی وحدت و سالمیت کو ختم کر دے گا۔

(باقی آئندہ)